OPEN ACCESS

Kashf Journal of Multidisciplinary Research
Vol: 02 - Issue 04 (2025)
P-ISSN: 3007-1992 E-ISSN: 3007-200X
https://kjmr.com.pk

خواتین کے اردو ناولوں میں پس نوآبادیاتی تناظر میں معاشی استحصال کی عکاسی

A Reflection of Post Colonial Economic Exploitation by Female Urdu Novelists

Umme Farwa
Scholar Ph.D. Urdu, Muslim Youth University, Islamabad.
Dr. Rabia Muqadas.
Adjunct Professor, Dept. of Urdu, Muslim Youth University, Islamabad.
***Corresponding author: Umme Farwa** (ufarwa216@gmail.com)*
DOI: *(https://doi.org/10.71146/kjmr419)*

Article Info

This article is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Commons Attribution (CC BY) license https://creativecommons.org/licenses/by/4.0

Abstract

The economic dimensions of postcolonialism are reflected in Urdu novels in a highly effective and realistic manner, with women novelists also making significant contributions in this regard. Urdu novelists have explored various issues arising from the colonial system, including economic disparities, the unequal distribution of resources, transformations in agricultural and industrial structures, feudal and capitalist exploitation, poverty, unemployment, class differences, and economic dependency. These novels demonstrate that the economic policies of the colonial era were not confined to their own time; rather, their effects continued to shape social and economic life long after independence. Many novels portray the lives of peasants, labourers, lower social classes, and marginalized communities in ways that reveal their economic hardships as part of a broader historical and exploitative system. Similarly, some novels address global capitalism, consumerism, privatization, the monopoly of powerful classes over resources, and the growing trends of economic inequality. These representations suggest that although colonial exploitation has transformed its forms over time, its fundamental nature continues to persist within various economic structures and power relations. In this context, the Urdu novel not only exposes the consequences of the colonial economic legacy but also sheds thought-provoking light on the need for economic justice, autonomy, and the restoration of human dignity. The present research examines selected works by women novelists from this perspective.

Keywords: *Postcolonialism, Economic Inequality, Capitalist Exploitation, Unemployment, Class Disparity*

پس نوآبادیاتی تنقید میں معاشی پہلو کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ نوآبادیاتی نظام کا اصل مقصد صرف سیاسی اقتدار یا عسکری غلبہ قائم کرنا نہیں تھا بلکہ ایک ایسا معاشی ڈھانچہ تشکیل دینا تھا جو استعماری طاقتوں کے مفادات کی مسلسل تکمیل کرتا رہے۔ پس نوآبادیاتی مفکرین کے نزدیک استعمار نے مقبوضہ علاقوں کی معیشت کو خود مختار اور خود کفیل بنانے کے بجائے اس انداز سے منظم کیا کہ وہ ہمیشہ استعماری مرکز کی ضروریات پوری کرنے کے قابل رہیں۔ اس مقصد کے لیے مقامی صنعتوں کو تباہ کیا گیا، زرعی نظام کو نقد آور فصلوں کی پیداوار تک محدود کیا گیا، قدرتی وسائل کو بے دریغ استعمال کیا گیا اور مقامی منڈیوں کو یورپی مصنوعات کی کھپت کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اس طرح نوآبادیاتی معیشت ایک ایسے غیر مساوی معاشی نظام میں تبدیل ہو گئی جس میں دولت، سرمایہ اور وسائل کا بہاؤ ہمیشہ نوآبادیات سے استعماری مرکز کی طرف رہا۔ قرۃ العین حیدر کا شاہکار ناول "آگ کا دریا" اردو میں پسِ نوآبادیاتی مطالعے کے لیے ایک ضخیم اور جامع متن کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول محض برطانوی راج کے خاتمے کی کہانی نہیں بلکہ نوآبادیاتی تجربے کے نتیجے میں انسانی ذہن، معیشت، سیاست اور رومان پر پڑنے والے انمٹ اثرات کا تجزیہ ہے۔ پسِ نوآبادیاتی مطالعہ ان اثرات کا جائزہ لیتا ہے جو استعمار کسی قوم کی ثقافت، معیشت اور نفسیات پر چھوڑ جاتا ہے۔ "آگ کا دریا" میں قرۃ العین حیدر نے دکھایا ہے کہ کس طرح ڈھائی ہزار سالہ قدیم ہندوستانی تہذیب برطانوی استعمار کے زیرِ اثر آ کر اپنی اصل شناخت کھو بیٹھی اور ایک ایسی مخلوط یعنی "ہائبرڈ" تہذیب نے جنم لیا جو نہ پوری طرح مشرقی رہی اور نہ ہی اسے مکمل مغربی کہا جا سکتا ہے۔ استحصالی نظام اور مقامی معیشت کی تباہی استعماری نظام کی دین ہے۔ استعمار کا بنیادی مقصد معاشی لوٹ مار ہوتا ہے۔ ناول "آگ کا دریا" میں نوآبادیاتی دور کے معاشی استحصال اور نیل (Indigo) کی کاشت کے ذریعے کسانوں کی تباہی کا ذکر ملتا ہے۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"بنگال کا کسان نوآبادیاتی دور میں نیل کے کھیتوں میں مشقت کرتا تھا۔۔۔ انگریز پلانٹرز اس سے جبراً نیل بوتے تھے اور پھر مختلف طریقوں سے اس پر ظلم توڑے جاتے تھے۔" [i]

پسِ نوآبادیاتی تناظر میں یہ اقتباس اس معاشی استعمار کی عکاسی کرتا ہے جس نے ہندوستان کے زرعی نظام کو اپنے تجارتی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ مقامی کسان اپنی ہی زمین پر اجنبی اور غلام بن کر رہ گیا جو آج بھی تیسری دنیا کے ممالک میں بین الاقوامی معاشی اداروں کے استحصال کی صورت میں نظر آتا ہے۔ پس نوآبادیاتی مفکرین اس امر پر متفق ہیں کہ آزادی کے بعد بھی یہ معاشی ڈھانچہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا بلکہ نئی عالمی معاشی قوتوں، بین الاقوامی مالیاتی اداروں، سرمایہ دارانہ نظام اور تجارتی معاہدوں کے ذریعے مختلف صورتوں میں برقرار رہا۔ اسی لیے پس نوآبادیاتی تنقید معاشی استحصال کو نوآبادیاتی نظام کی بنیادی شناخت قرار دیتی ہے اور اسے سیاسی آزادی سے کہیں زیادہ دیرپا اور گہرا مسئلہ تصور کرتی ہے۔ پس نوآبادیاتی فکر کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ استعمار معاشی استحصال کا ایک منظم منصوبہ تھا، جس کا مقصد مقبوضہ علاقوں کی معاشی ترقی نہیں بلکہ ان کے وسائل، محنت اور پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا۔ نوآبادیاتی طاقتوں نے مقامی معیشت کو اس انداز سے استوار کیا کہ نوآبادیات خام مال کی پیداوار اور فراہمی کا ذریعہ بن جائیں، جبکہ صنعتی پیداوار اور سرمایہ کاری کا مرکز یورپ رہے۔ کپاس، جُوٹ، چائے، کافی، گنا، مصالحہ جات، معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل انتہائی کم قیمت پر استعماری ممالک منتقل کیے جاتے تھے، جہاں انہیں صنعتی مصنوعات میں تبدیل کر کے دوبارہ نوآبادیاتی منڈیوں میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس غیر مساوی تجارتی نظام نے مقامی صنعتوں کو شدید نقصان پہنچایا اور مقامی آبادی کو معاشی خود مختاری سے محروم کر دیا۔ استعمار نے صرف تجارت ہی کو اپنے مفاد کے مطابق منظم نہیں کیا بلکہ زرعی ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا۔ غذائی اجناس کی جگہ برآمدی فصلوں کی کاشت کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ استعماری صنعتوں کو خام مال مسلسل فراہم ہوتا رہے۔ اس تبدیلی کے نتیجے میں کئی نوآبادیاتی معاشرے غذائی قلت، غربت اور قحط جیسے مسائل سے دوچار ہوئے، جبکہ ان کی مقامی معیشت بیرونی منڈیوں کی محتاج بنتی چلی گئی۔ اسی طرح مقامی دستکاری، چھوٹی صنعتوں اور روایتی کاروبار کو دانستہ طور پر کمزور کیا گیا تاکہ یورپی مصنوعات کے لیے نئی منڈیاں پیدا ہوں۔ پس نوآبادیاتی مفکرین اس معاشی حکمتِ عملی کو استعمار کی سب سے مؤثر پالیسی قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس نے مقبوضہ علاقوں کو طویل عرصے تک معاشی انحصار میں مبتلا رکھا۔ سیاسی آزادی کے بعد بھی یہ معاشی ڈھانچہ مکمل طور پر تبدیل نہ ہو سکا۔ نوآزاد ریاستیں سرمایہ،

ٹیکنالوجی، بیرونی تجارت اور مالی امداد کے لیے انہی طاقتوں کی محتاج رہیں جو کبھی ان پر براہِ راست حکمرانی کرتی تھیں۔ بعد ازاں بین الاقوامی مالیاتی اداروں، عالمی تجارتی معاہدوں، قرضوں، نجکاری کی پالیسیوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اسی معاشی انحصار کو نئی شکلوں میں برقرار رکھا۔ اس لیے پس نوآبادیاتی تنقید کے مطابق نوآبادیاتی دور کا معاشی استحصال محض تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسا مسلسل عمل ہے جس کے اثرات آج بھی ترقی پذیر ممالک کی معاشی ساخت، بے روزگاری، غربت، طبقاتی تفاوت اور مالیاتی عدم استحکام میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ نوآبادیات نے پرانے معاشی انداز کو بدل کر نئی طرز متعارف کروائی۔ قرۃ العین حیدر اپنے ناول "آگ کا دریا" میں لکھتی ہیں:

پرانے زمانے میں درباری بھاٹ کھشتری ہوتا تھا۔ بعد میں درباری شاعری نے رزمیہ داستانوں کے لیے راستہ تیار کیا۔ اب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہو رہی تھیں اور شاعر جو پہلے درباروں سے وابستہ تھے، اب گلی گلی اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی روزی کماتے تھے۔"[ii]

اس اقتباس میں قرۃ العین حیدر برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی و معاشی ڈھانچے کی ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جو پس نوآبادیاتی معاشی اثرات کو نمایاں کرتی ہے۔ درباری نظام کے خاتمے کے ساتھ وہ معاشی ڈھانچہ بھی بکھر گیا جس پر ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی روزی کا انحصار تھا۔ نوآبادیاتی اقتدار نے مقامی ریاستوں اور ان کے سرپرستی کے نظام کو کمزور یا ختم کر کے روایتی معاشی وسائل کی جگہ ایک نیا استعماری معاشی نظام قائم کیا، جس میں ثقافتی اور ادبی سرگرمیاں بھی منڈی اور انفرادی بقا کے تقاضوں کے تابع ہو گئیں۔ نتیجتاً دربار سے وابستہ شاعر، جو پہلے مستقل معاشی تحفظ رکھتے تھے، روزگار کی تلاش میں گلی گلی اور گاؤں گاؤں پھرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ نوآبادیاتی تبدیلیوں نے صرف سیاسی اقتدار ہی منتقل نہیں کیا بلکہ مقامی معاشی ڈھانچوں، پیشہ ورانہ استحکام اور ثقافتی سرپرستی کو بھی شدید متاثر کیا۔ یوں ادب اور فن، جو کبھی ریاستی سرپرستی کے تحت فروغ پاتے تھے، معاشی عدم تحفظ اور بقا کی جدوجہد کا شکار ہو گئے، جو پس نوآبادیاتی معاشی تنقید کے مطابق نوآبادیاتی نظام کے اس ورثے کی نمائندگی کرتا ہے جس نے مقامی معاشی خود مختاری اور ثقافتی معیشت دونوں کو کمزور کر دیا۔

پس نوآبادیاتی تنقید میں فرانز فینن کو ان مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے نوآبادیاتی نظام کے معاشی پہلو کو نہایت گہرائی سے واضح کیا۔ ان کے نزدیک استعمار کی کامیابی کا راز صرف عسکری قوت یا سیاسی اقتدار میں نہیں بلکہ اس معاشی ڈھانچے میں پوشیدہ تھا جس کے ذریعے نوآبادیاتی طاقتیں مقبوضہ علاقوں کے قدرتی وسائل، انسانی محنت اور معاشی سرگرمیوں پر مکمل اختیار حاصل کر لیتی تھیں۔ فینن کے مطابق نوآبادیاتی نظام مقامی آبادی کی فلاح یا ترقی کے لیے قائم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا مقصد استعماری ریاست کی معیشت کو مضبوط بنانا ہوتا ہے۔ اسی لیے نوآبادیاتی حکومتیں اپنی تمام معاشی پالیسیوں کو اس انداز سے ترتیب دیتی ہیں کہ نوآبادیات ہمیشہ خام مال کی فراہمی اور سستی محنت کا ذریعہ بنی رہیں، جبکہ صنعتی ترقی، سرمایہ کاری اور منافع کا مرکز یورپی ممالک ہوں۔ فینن نے واضح کیا کہ نوآبادیاتی معیشت دراصل ایک غیر مساوی معاشی نظام ہے جس میں پیداوار اور تجارت کے تمام ذرائع استعماری مفادات کے تابع ہوتے ہیں۔ مقامی صنعتوں کی حوصلہ شکنی، روایتی دستکاری کی تباہی، زرعی نظام میں تبدیلی، معدنی وسائل کا بے دریغ استعمال اور مقامی منڈیوں پر بیرونی اجارہ داری اسی معاشی منصوبے کا حصہ تھے۔ اس نظام کے نتیجے میں نوآبادیاتی معاشرے نہ صرف معاشی خود مختاری سے محروم ہوئے بلکہ ان کی داخلی ترقی کے امکانات بھی محدود ہو گئے۔ فینن اسی حقیقت کو نہایت جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The colonial economy is not an economy of growth, but an economy of pillage."[iii]

اس اقتباس میں economy of pillage (لوٹ مار پر مبنی معیشت) کی اصطلاح پورے نوآبادیاتی معاشی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ فینن کے نزدیک استعمار کی معیشت کبھی بھی نوآبادیاتی علاقوں کی ترقی یا خوش حالی کے لیے کام نہیں کرتی بلکہ اس کا مقصد ان علاقوں کی دولت، وسائل اور محنت کو مسلسل استعماری مرکز کی

طرف منتقل کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیاتی ریاستوں میں انفراسٹرکچر، ریلوے، بندرگاہیں یا دیگر ترقیاتی منصوبے بھی بنیادی طور پر مقامی عوام کی ضروریات کے بجائے خام مال کی ترسیل اور استعماری تجارت کو سہولت فراہم کرنے کے لیے قائم کیے گئے۔ فینن کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ سیاسی آزادی حاصل ہونے کے بعد بھی نوآبادیاتی معاشرے حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو پاتے، کیونکہ ان کی معیشت سابق استعماری طاقتوں اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام پر منحصر رہتی ہے۔ دراصل عالمی سرمایہ داری کا ڈھانچہ اس قدر مضبوط ہے کہ اس کے مقابل مشرقی اداروں کی کوئی وقعت نہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" سے ایسی ہی ایک مثال دیکھیے جس سے استعمار کی مقامی اداروں پر فوقیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"سرل کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا اور ان دنوں وطن آیا ہوا تھا۔

"کیا کہا؟ تم شاعری کرنا چاہتے ہو؟ ڈرامے لکھا کروگے؟ وکالت بڑا نوبل پیشہ ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔۔

چند روز بعد پیٹر اسے سٹی میں اپنے چچا کے پاس لے گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ڈائریکٹر تھا۔ سرل کو کلکتے میں ملازمت مل گئی۔"[iv]

اس اقتباس میں قرۃ العین حیدر نوآبادیاتی دور میں معاشی ترجیحات اور روزگار کے بدلتے ہوئے تصورات کو نمایاں کرتی ہیں۔ پس نوآبادیاتی معاشی تناظر میں ایسٹ انڈیا کمپنی محض ایک تجارتی ادارہ نہیں بلکہ استعماری سرمایہ داری اور معاشی غلبے کی علامت ہے، جس نے تجارت کے ذریعے مقبوضہ علاقوں کے وسائل، افرادی قوت اور روزگار کے مواقع پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ پیٹر جیکسن کا شاعری اور ادب کو غیر عملی قرار دے کر وکالت اور کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دینا اس نوآبادیاتی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں علم اور پیشے کی قدر کا معیار معاشی منفعت اور استعماری نظام کی ضروریات بن جاتا ہے۔ سرل کا ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت حاصل کرنا اس امر کی علامت ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے تعلیم یافتہ افراد کو اپنی معاشی اور انتظامی مشینری کا حصہ بنا کر ایک ایسا متوسط طبقہ تشکیل دیا جو روزگار اور معاشی استحکام کے لیے استعماری اداروں پر انحصار کرنے لگا۔ یوں یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ نوآبادیاتی معاشی ڈھانچے نے نہ صرف مقامی معیشت کو اپنے مفادات کے تابع کیا بلکہ افراد کی پیشہ ورانہ ترجیحات، سماجی اقدار اور معاشی خواہشات کو بھی اس انداز سے تشکیل دیا کہ تخلیقی اور ثقافتی سرگرمیوں کے مقابلے میں استعماری ملازمت اور معاشی منفعت کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، جو پس نوآبادیاتی معاشی تنقید کا ایک اہم پہلو ہے۔ استعماری طاقتوں نے نوآبادیاتی آبادی کو ہمیشہ کمزور اور احمق گردانا اور یہ کسی قدر درست ہی ہے کیونکہ جب ہی تو نوآبادیاتی اقوام پر استعمار کا سکہ رائج رہا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول "آخر شب کے ہمسفر" میں اسی خیال کو بنیاد بناتے ہوئے لکھا ہے:

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیوسنس (Nuisance) سمجھتی تھی۔۔۔ لیکن اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔" [v]

اس اقتباس میں قرۃ العین حیدر نوآبادیاتی اقتدار کے اس فکری اور معاشی جواز کو بے نقاب کرتی ہیں جس کے ذریعے استعماری قوتیں مقبوضہ اقوام پر اپنی بالادستی کو فطری اور ضروری ثابت کرتی تھیں۔ پس نوآبادیاتی معاشی تناظر میں ہندوستانیوں کو کمزور اور احمق کردار کا حامل قرار دینا محض ایک نسلی یا ثقافتی تعصب نہیں بلکہ استحصال پر مبنی معاشی نظام کو دوام بخشنے کی ایک حکمتِ عملی ہے۔ جب کسی قوم کو فطری طور پر نالائق اور محکوم ثابت کر دیا جائے تو اس کے وسائل، تجارت، صنعت اور محنت پر قبضے کو بھی جائز قرار دینا آسان ہو جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتدا میں اگرچہ مشنری سرگرمیوں کو غیر ضروری سمجھا، لیکن بعد میں مذہبی اور فکری بیانیے نے استعماری معاشی مفادات کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا، کیونکہ مقامی آبادی کی ذہنی محکومی اس کے معاشی استحصال کو بھی آسان بناتی تھی۔ اس طرح نوآبادیاتی قوتیں ایک ایسا تصور قائم کرتی ہیں جس میں مقامی باشندے ترقی اور خود مختاری کے اہل نہیں، لہٰذا ان کے وسائل اور معیشت پر بیرونی تسلط کو ایک ناگزیر

امر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یوں یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ پس نوآبادیاتی معاشی تنقید کے مطابق استعماری نظام صرف عسکری یا سیاسی طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ فکری برتری کے دعوے کے ذریعے بھی مقامی اقوام کی معاشی خود مختاری کو سلب کرتا اور استحصالی معاشی ڈھانچے کو مستحکم بناتا ہے۔

فینن کے نظریات کی روشنی میں موجودہ دور کے بہت سے معاشی مسائل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک پر بڑھتے ہوئے بیرونی قرضے، عالمی مالیاتی اداروں کی شرائط، نجکاری کی پالیسیاں، کثیر القومی کمپنیوں کی اجارہ داری، خام مال کی غیر مساوی تجارت اور عالمی منڈی پر انحصار اسی نوآبادیاتی معاشی ورثے کی نئی شکلیں ہیں۔ اگرچہ ان ذرائع میں براہِ راست سیاسی قبضہ موجود نہیں، لیکن معاشی فیصلوں پر بیرونی اثر ورسوخ نوآبادیاتی غلبے کے تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسی لیے فینن معاشی خود مختاری کو حقیقی آزادی کی بنیادی شرط قرار دیتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب تک نوآزاد ممالک اپنے وسائل، پیداوار اور معاشی پالیسیوں پر مکمل اختیار حاصل نہیں کرتے، اس وقت تک نوآبادیاتی نظام کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکتے۔ فینن کا کہنا ہے:

> "The national middle class discovers its historic mission: that of intermediary. Seen through its eyes, its mission has nothing to do with transforming the nation; it consists, prosaically, of being the transmission line between the nation and a capitalism, rampant though camouflaged, which today puts on the mask of neo-colonialism."[vi]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ فینن نوآبادیاتی بعد کے معاشی نظام کو محض ماضی کا مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے ایک ایسے مسلسل عمل کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں قومی اشرافیہ، عالمی سرمایہ دارانہ نظام اور سابق استعماری طاقتیں مل کر معاشی انحصار کو برقرار رکھتی ہیں۔ اسی بنا پر ان کے معاشی نظریات پس نوآبادیاتی تنقید میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور آج بھی ترقی پذیر ممالک کی معاشی صورتِ حال کو سمجھنے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد مقامی حکمران طبقہ اکثر انہی معاشی ڈھانچوں کو برقرار رکھتا ہے جو نوآبادیاتی دور میں قائم کیے گئے تھے۔ اس طرح نوآزاد ریاستیں سرمایہ، ٹیکنالوجی، تجارت، قرضوں اور بیرونی امداد کے لیے مسلسل ترقی یافتہ ممالک کی محتاج رہتی ہیں۔ فینن اس کیفیت کو Neo-colonialism سے تعبیر کرتے ہیں، جس میں براہِ راست سیاسی قبضہ ختم ہو جاتا ہے لیکن معاشی غلبہ بدستور برقرار رہتا ہے۔ اسی تناظر میں فینن مقامی اشرافیہ پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق آزادی کے بعد یہی طبقہ قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم یا مقامی صنعتوں کی ترقی کے بجائے سابق استعماری طاقتوں کے معاشی مفادات کا محافظ بن جاتا ہے۔ اس مخصوص طبقے کی عکاسی بانو قدسیہ اپنے ناول "راجہ گدھ" میں اس طرح کرتی ہیں:

> "غور کرو۔۔ سوچو زرا۔۔ تجزیہ کرو ساری سیچوایشن کا، پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ ء میں جوان تھا اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا۔۔ اس طبقے نے افسر شاہی کے وہ تجارت پیشہ پیدا کیے جو آج Business Magnets ہیں۔ اس نے ان بینکروں کو جنم دیا جنہوں نے سارے ملک کو نوٹ زدہ کر دیا۔ اس طبقے سے وہ پروفیسر اٹھے جنہیں تعلیم سے زیادہ گریڈوں کی فکر تھی۔ وہ ڈاکٹر سامنے آئے جو بیرونی ممالک میں اس لیے عمریں گزارتے ہیں کہ وہاں پیسہ زیادہ ہے۔ اس طبقے سے ہی وہ دانشور پیدا ہوئے جن کی اپنی کوئی Conviction نہیں۔ ان کی سوچ چاہے سرخ چین سے آئے یا سرمایہ دارانہ نظام سے، ان کی اپنی نہیں ہوتی۔ Greed میں مبتلا یہ لوگ ہمیں ایک ہی میراث دے سکتے ہیں۔۔ Conflict، اندر کا تضاد، حالات کا تضاد، شخصیتوں کا تضاد۔۔۔"[vii]

پس نوآبادیاتی معاشی تناظر میں یہ اقتباس اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ سیاسی آزادی کے باوجود نوآبادیاتی معاشی ڈھانچے، طبقاتی تقسیم اور استحصالی نظام اپنی مختلف صورتوں میں برقرار رہے۔ بانو قدسیہ اس امر کی طرف توجہ دلاتی ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد وجود میں آنے والا نیا مراعات یافتہ طبقہ قومی وسائل، ریاستی اداروں اور معاشی مواقع پر اس انداز سے قابض ہوا کہ معاشی انصاف، سماجی مساوات اور قومی ترقی کے مقاصد پس منظر میں چلے گئے۔ پس نوآبادیاتی مفکر فرانز فینن کے مطابق آزادی کے بعد ابھرنے والی قومی بورژوازی اکثر نوآبادیاتی طاقتوں کی جگہ لے کر انہی استحصالی معاشی ڈھانچوں کو برقرار رکھتی ہے۔ چنانچہ بانو قدسیہ کا یہ تجزیہ صرف چند افراد پر تنقید نہیں بلکہ ایک ایسے معاشی نظام پر سوال اٹھاتا ہے جس میں اقتدار، سرمایہ اور ریاستی وسائل محدود طبقے کے مفادات کے تابع ہو جاتے ہیں۔ مصنفہ اس اقتباس میں آزادی کے بعد پیدا ہونے والے اس معاشرتی طبقے کی ذہنیت کا جائزہ لیتی ہیں جس نے اپنی معاشی ترقی کو قومی ترقی پر ترجیح دی۔ ان کے نزدیک ریاستی ادارے، بیوروکریسی، بینکاری، تعلیم، طب اور دانش ورانہ حلقے بتدریج ایسے مفادات کے زیرِ اثر آ گئے جہاں خدمت، دیانت اور قومی ذمہ داری کے بجائے ذاتی منفعت اور دولت کا حصول بنیادی مقصد بن گیا۔ اس صورتِ حال نے قومی وسائل کی غیر مساوی تقسیم کو فروغ دیا اور ایک ایسا سرمایہ دارانہ ماحول پیدا کیا جس میں عوامی مفاد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔ پس نوآبادیاتی نظریہ اسی حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جب آزادی کے بعد معاشی ڈھانچے تبدیل نہیں ہوتے تو استحصال کی نوعیت ضرور بدل جاتی ہے، مگر اس کا وجود برقرار رہتا ہے۔ ریاستی اشرافیہ، سرمایہ دار طبقہ اور طاقت ور ادارے مل کر ایک ایسا نظام تشکیل دیتے ہیں جس میں معاشی مواقع چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتے ہیں اور اکثریتی آبادی محرومی، بے روزگاری اور عدم مساوات کا شکار رہتی ہے۔ بانو قدسیہ اس پورے منظر نامے میں تعلیم، دانش اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے زوال کو بھی معاشی مفاد سے وابستہ کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک جب معاشرہ سرمایہ کو کامیابی کا واحد معیار بنا لیتا ہے تو تعلیمی ادارے علم و شعور کی تخلیق کے بجائے معاشی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی قومی خدمت کے بجائے زیادہ مالی منفعت کے حصول کو ترجیح دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسانی صلاحیتیں قومی تعمیر کے بجائے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو مضبوط کرنے میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ یہ کیفیت پس نوآبادیاتی معاشی انحصار کی واضح مثال ہے، جہاں ترقی پذیر ممالک اپنی بہترین افرادی قوت سے محروم ہوتے رہتے ہیں جبکہ ترقی یافتہ معیشتیں اس سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فکری خود مختاری بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور مقامی دانش ور بیرونی نظریات کے زیرِ اثر اپنی فکری شناخت کھو بیٹھتے ہیں، جس سے قومی مسائل کا مقامی تناظر میں حل تلاش کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ یہ اقتباس حرص، صارفیت اور سرمایہ پرستی کو محض اخلاقی برائی نہیں بلکہ ایک گہرے معاشی بحران کی علامت قرار دیتا ہے۔ جب معاشی نظام انصاف، مساوات اور اجتماعی فلاح کے بجائے ذاتی مفادات پر استوار ہو جائے تو اس کے نتیجے میں معاشرے میں طبقاتی فاصلے بڑھتے ہیں، قومی ادارے کمزور ہوتے ہیں، سماجی اعتماد ختم ہوتا ہے اور فرد مسلسل داخلی و خارجی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بانو قدسیہ معاشی بے اعتدالی کو سماجی، فکری اور اخلاقی تضادات کی بنیادی وجہ قرار دیتی ہیں۔ پس نوآبادیاتی معاشی تناظر میں یہ اقتباس اس امر کی مؤثر ترجمانی کرتا ہے کہ حقیقی آزادی صرف سیاسی اقتدار کے انتقال سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے استحصالی معاشی ڈھانچوں کی تبدیلی، وسائل کی منصفانہ تقسیم، فکری خود مختاری اور قومی مفاد پر مبنی معاشی نظام کا قیام ناگزیر ہے۔ جب تک نوآبادیاتی ورثے سے جنم لینے والی معاشی ناہمواریاں ختم نہیں ہوتیں، اس وقت تک آزادی کے ثمرات معاشرے کے تمام طبقات تک نہیں پہنچ سکتے اور داخلی تضادات قومی ترقی کی راہ میں مسلسل رکاوٹ بنتے رہتے ہیں۔

پس نوآبادیاتی تنقید میں گیاتری چکرورتی اسپیواک کا شمار ان ممتاز مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے نوآبادیاتی اور نوآبادیاتِ نو کے معاشی اثرات کو سماجی، ثقافتی اور صنفی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک نوآبادیاتی استحصال صرف قدرتی وسائل یا قومی معیشت تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ انسانی محنت، سماجی طبقات اور بالخصوص ان افراد کو بھی متاثر کرتا ہے جو پہلے ہی معاشرے کے کمزور اور محروم طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسپیواک ان طبقات کو Subaltern کا نام دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک سب آلٹرن وہ لوگ ہیں جو طاقت، وسائل، سرمایہ اور فیصلہ سازی کے مراکز سے دور ہوتے ہیں اور جن کی آواز سیاسی، معاشی اور سماجی نظام میں مؤثر انداز میں سنی نہیں جاتی۔ اسپیواک کے مطابق عالمی سرمایہ دارانہ نظام نے نوآبادیاتی دور کے معاشی استحصال کو نئی شکل دے دی ہے۔ اگرچہ براہِ راست

نوآبادیاتی حکومتیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن ترقی پذیر ممالک کی سستی محنت، قدرتی وسائل اور کمزور معیشتیں اب بھی عالمی منڈی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ وہ اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عالمی سرمایہ داری نے ترقی پذیر ممالک میں مزدور طبقے، دیہی آبادی اور خصوصاً خواتین کو کم اجرت، غیر محفوظ روزگار اور غیر مساوی معاشی مواقع کا شکار بنا دیا ہے۔ اس طرح معاشی ترقی کے فوائد زیادہ تر سرمایہ دار طبقے اور ترقی یافتہ ممالک کو حاصل ہوتے ہیں، جبکہ محنت کرنے والے طبقات استحصال کا شکار رہتے ہیں۔ اسپیواک اس پورے نظام کے اندر موجود ان افراد کی طرف توجہ مبذول کراتی ہیں جو سب سے زیادہ استحصال کا شکار ہوتے ہیں مگر جن کی آواز علمی، سیاسی اور معاشی مباحث میں اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا نظریہ پس نوآبادیاتی معاشی فکر میں ایک انسانی اور اخلاقی جہت کا اضافہ کرتا ہے۔ اسپیواک کا پورا استدلال یہی واضح کرتا ہے کہ طاقت کے ڈھانچوں میں سب آلٹرن طبقہ اپنی نمائندگی سے محروم رہتا ہے، اور یہی محرومی معاشی نظام میں بھی نظر آتی ہے۔ سب آلٹرن طبقہ ہر حال میں پستا ہے، قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" سے اس طبقے کی مثال ملاحظہ ہو:

"ہند پر اب مغل شہنشاہوں کا راج ہے۔ پرانا نظام بدل چکا ہے۔۔۔ لیکن وہ کسان موجود ہے جو گھٹنوں تک پانی میں جھکا دھان کی فصل بو رہا ہے۔"[viii]

اس اقتباس میں قرۃ العین حیدر اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ اقتدار اور حکمرانوں کی تبدیلی کے باوجود عام کسان کی معاشی حالت میں کوئی بنیادی فرق نہیں آتا۔ پس نوآبادیاتی تناظر میں یہ منظر اس استحصالی معاشی نظام کی علامت ہے جو مختلف ادوار میں صرف حکمرانوں کی شکل بدلتا ہے، مگر محنت کش طبقہ مسلسل معاشی مشقت، غربت اور وسائل کی ناہموار تقسیم کا شکار رہتا ہے۔ مغل اقتدار کا قیام ایک نئے سیاسی نظام کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن دھان کے کھیت میں جھکا ہوا کسان اس بات کی علامت ہے کہ پیداوار کا اصل بوجھ ہمیشہ نچلے طبقے پر ہی رہا، جبکہ اس کی محنت کے ثمرات حکمران اور بالادست طبقات سمیٹتے رہے۔ پس نوآبادیاتی تنقید اس صورتِ حال کو تاریخی استحصال کے تسلسل کے طور پر دیکھتی ہے، جہاں نوآبادیاتی اور قبل از نوآبادیاتی دونوں معاشی ڈھانچوں میں کسان کی زندگی محرومی، محنت اور معاشی انحصار سے عبارت رہتی ہے۔ یوں یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ سیاسی تبدیلی اس وقت تک حقیقی معاشی تبدیلی میں تبدیل نہیں ہوتی جب تک پیداوار، وسائل اور دولت کی منصفانہ تقسیم کو یقینی نہ بنایا جائے، اور یہی نکتہ پس نوآبادیاتی معاشی فکر کا ایک بنیادی موضوع ہے۔ اسپیواک کی فکر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاشی استحصال کو صنفی تناظر سے بھی دیکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ نظام میں خواتین، خصوصاً غریب اور دیہی خواتین، دوہرے استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ طبقاتی اور معاشی محرومی برداشت کرتی ہیں اور دوسری طرف صنفی امتیاز کا سامنا کرتی ہیں۔ "راجہ گدھ" سے ایک مثال دیکھیے:

"ایک بھوک سے ہمیشہ دوسری بھوک کا چراغ جلتا ہے۔ پچھلی صدی میں بھوک کی نمائش جنسی آمادگی کے مترادف تھی۔ میلے ٹھیلے پر یاروں سے لڈو جلیبیاں لے کر کھانے والی بنتو مردوں میں تو مقبول تھی لیکن اپنی ہم جنسوں میں وہ بڑی بدنام تھی اور سسرال جا کر بسنا اس کے لیے مشکل تھا۔"[ix]

اس اقتباس میں بانو قدسیہ مابعد نوآبادیاتی معاشرے میں صنفی امتیاز کو سماجی اور ثقافتی اقدار کے تناظر میں پیش کرتی ہیں۔ مصنفہ یہ واضح کرتی ہیں کہ عورت کی خواہشات اور جذبات کو ایک ایسے سماجی نظام کے تحت پرکھا جاتا ہے جو نوآبادیاتی اور مقامی اخلاقی تصورات کے امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ بھوک کو جنسی خواہش اور انسانی جذبے کی علامت بنا کر یہ بتایا گیا ہے کہ گزشتہ صدی میں عورت کے معمولی سماجی میل جول یا اپنی خواہش کے اظہار کو بھی اس کی جنسی آمادگی سے تعبیر کیا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں اس کی عزت، محبت اور ازدواجی مستقبل متاثر ہوتے تھے۔ مابعد نوآبادیاتی تناظر میں یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ نوآبادیاتی دور کے اخلاقی معیارات نے مقامی معاشرے میں رومانوی تعلقات کو فطری انسانی جذبے کے بجائے سماجی نگرانی، بدنامی اور کردار کے پیمانوں سے وابستہ کر دیا۔ بنتو کا مردوں میں مقبول مگر عورتوں میں بدنام ہونا اس دوہرے معیار کو ظاہر کرتا ہے جس میں رومانویت اور محبت عورت کے لیے آزادی کا نہیں بلکہ سماجی سزا اور شناخت کے بحران کا سبب بن جاتی ہے۔ یوں یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ مابعد نوآبادیاتی معاشرے میں رومانوی تعلقات پر فرد کی ذاتی خواہش سے زیادہ سماجی اقدار، اخلاقی

نگرانی اور صنفی امتیاز حاوی رہتے ہیں، جس کے باعث محبت اور جذبات اپنی فطری معنویت کھو کر سماجی کنٹرول کا ایک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ عورت کے ساتھ یہ امتیاز اس لیے برتا جاتا ہے کیونکہ وہ معاشی طور پر خود مختار نہیں اور مرد کے زیر دست ہے۔ پس نوآبادیاتی معاشی فکر میں اسپیواک کا سب سے بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے معاشی استحصال کو محض ریاستوں یا عالمی نظام کے درمیان تعلق کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اس کے اثرات کو عام انسان، مزدور، عورت اور سب آلٹرن طبقات کی زندگی سے جوڑ کر واضح کیا۔ ان کے نزدیک معاشی انصاف اسی وقت ممکن ہے جب ترقی کا عمل صرف سرمایہ کے ارتکاز تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے ثمرات سماج کے ان طبقات تک بھی پہنچیں جو تاریخی طور پر استحصال، محرومی اور خاموشی کا شکار رہے ہیں ۔استعماری ڈھانچوں کی تنظیم کی بابت قرۃ العین حیدر کے ناول "سفینہ غم دل" سے ایک اقتباس دیکھیے:

"علی گڑھ سے ان کو ابا جان اور امی کے ساتھ پورٹ بلئیر جانا پڑا جو ایک مثالی برطانوی نوآبادی تھی۔ ایسی نوآبادی جو دنیا کے سمندروں، جزیروں، ساحلوں اور براعظموں میں ہر جگہ موجود ہے۔ برطانوی براکریسی کے اس دور افتادہ اولپس پر سول سروس کے تین ہندوستانی عہدے دار تھے۔"[x]

یہ اقتباس پس نوآبادیاتی معاشرے میں نوآبادیاتی انتظامی نظام کی ساخت اور اس کے دیرپا اثرات کو نمایاں کرتا ہے۔ برطانوی استعمار نے مختلف نوآبادیوں میں ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ قائم کیا جو مرکز کی سیاسی اور معاشی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ اس نظام میں مقامی افراد کو محدود پیمانے پر شامل ضرور کیا جاتا تھا، لیکن انہیں فیصلہ سازی اور اقتدار کے حقیقی مراکز تک مکمل رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح نوآبادیاتی اقتدار مقامی شرکت کا تاثر دیتے ہوئے بھی اپنی بالادستی برقرار رکھتا تھا۔

پس نوآبادیاتی تناظر میں یہ صورتِ حال اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ استعمار نے مختلف خطوں میں ایک مشترکہ طرزِ حکمرانی، بیوروکریسی اور انتظامی ثقافت کو فروغ دیا، جس کے اثرات آزادی کے بعد بھی ریاستی اداروں میں موجود رہے۔ نوآبادیاتی بیوروکریسی نظم و ضبط، قانون اور انتظام کے نام پر قائم کی گئی، مگر اس کا بنیادی مقصد مقامی آبادی کی خدمت سے زیادہ استعماری اقتدار کا تحفظ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی بہت سے پس نوآبادیاتی ممالک میں انتظامی ادارے عوامی شمولیت کے بجائے اختیارات کے ارتکاز اور بالادستی کی روایت کو آگے بڑھاتے رہے۔ یہ اقتباس اس امر کو بھی واضح کرتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے مقامی تعلیم یافتہ طبقے کو ریاستی مشینری کا حصہ بنا کر ایک ایسا متوسط و اشرافی طبقہ پیدا کیا جو استعماری نظم و نسق کے اصولوں کے مطابق تربیت یافتہ تھا۔ اگرچہ اس طبقے کی موجودگی مقامی نمائندگی کی علامت دکھائی دیتی تھی، لیکن مجموعی ڈھانچہ استعماری مفادات کے تابع رہتا تھا۔ اس اعتبار سے اقتباس اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ پس نوآبادیاتی معاشروں کے کئی انتظامی، سیاسی اور ادارہ جاتی مسائل نوآبادیاتی ورثے سے جڑے ہوئے ہیں، جنہوں نے آزادی کے بعد بھی ریاست اور معاشرے کے تعلقات کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ رضیہ فصیح احمد نے اپنے ناول "موسم گل" میں ایک ایسے نظام کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں یورپ کی صنعتی مصنوعات کو کسی نعمت سے کم نہیں سمجھا جاتا:

"کوئی جونامارکیٹیا ہے۔" تارہ نے اعلان کیا۔

"جونامارکیٹیا کیا؟" سارہ نے پوچھا۔

"ارے بھئی جونامارکیٹ کے کباڑی بازار سے کوٹ پتلون خرید کر جو صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔"

"تمیز بھی ہے تمہیں کپڑے کی؟ بہترین سوٹ پہنے ہوئے ہے انگریزی کپڑے کا۔" شفو بگڑ کر بولا

"فارن مال تھا جب تو ضرور ہی جونامارکیٹ کا ہوگا، ورنہ انگریزی کپڑا آج کل کہاں ملتا ہے بھلا؟"[xi]

اس اقتباس میں مابعد نوآبادیاتی معاشی تناظر میں نوآبادیاتی ورثے، درآمدی اشیا کی معاشی حیثیت اور صارفانہ ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے۔ انگریزی کپڑے اور "فارن مال" کا ذکر اس ذہنیت کی نشاندہی کرتا ہے جس کے تحت نوآبادیاتی دور کے بعد بھی مغربی مصنوعات کو اعلیٰ معیار، سماجی وقار اور معاشی برتری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ سیاسی طور پر نوآبادیاتی دور ختم ہو چکا ہے لیکن معاشی سطح پر مغربی اشیا کی کشش اور ان کی علامتی اہمیت برقرار رہتی ہے جو مابعد نوآبادیاتی معاشروں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جو نامارکیٹ یا کباڑی بازار کا حوالہ اس معاشی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی معاشرے کا ایک بڑا طبقہ نئی درآمدی اشیا خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لہٰذا استعمال شدہ یا سیکنڈ ہینڈ غیر ملکی اشیا خرید کر اپنی معاشی اور سماجی حیثیت بہتر دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صورتِ حال نوآبادیاتی معاشی ڈھانچے کے اس نقص کی عکاسی کرتی ہے جس میں دولت کی غیر مساوی تقسیم نے متوسط اور نچلے طبقے کو محدود وسائل کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ مابعد نوآبادیاتی تنقید کے مطابق نوآبادیاتی نظام نے مقامی صنعتوں کو کمزور اور بیرونی مصنوعات کو برتر بنا کر ایسی معیشت تشکیل دی جس میں درآمدی اشیا سماجی امتیاز کی علامت بن گئیں۔ آزادی کے بعد بھی یہ معاشی ترجیحات مکمل طور پر تبدیل نہ ہو سکیں۔ فرانز فینن کے مطابق نوآبادیاتی نظام صرف وسائل پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ ایسی معاشی نفسیات بھی پیدا کرتا ہے جس میں مقامی افراد غیر ملکی اشیا کو معیارِ زندگی اور کامیابی کی علامت سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ہومی کے بھابھا کے تصورِ نقالی کی روشنی میں دیکھا جائے تو مغربی لباس اور طرزِ زندگی کی نقل محض ثقافتی عمل نہیں بلکہ نوآبادیاتی معاشی اثرات کی بھی نمائندگی کرتی ہے، جہاں غیر ملکی مصنوعات سماجی وقار اور برتری کی علامت بن جاتی ہیں۔ یہ اقتباس اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتا ہے کہ نوآبادیاتی معیشت نے مقامی پیداوار کے مقابلے میں درآمدی اشیا کو زیادہ معتبر بنا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں صارفین کی ترجیحات، خریداری کے رجحانات اور معاشی اقدار اس طرح تشکیل پائیں کہ "انگریزی کپڑا" محض لباس نہیں بلکہ ایک سماجی و معاشی شناخت کی علامت بن گیا۔ رضیہ فصیح احمد اس طنزیہ مکالمے کے ذریعے یہ واضح کرتی ہیں کہ نوآبادیاتی معاشی اثرات آزادی کے بعد بھی صارفانہ رویوں، طبقاتی امتیاز اور معاشی اقدار میں زندہ رہتے ہیں، اور یہی مابعد نوآبادیاتی معاشی صورتِ حال کی ایک اہم علامت ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

[i] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، مکتبہ اردو، لاہور، 1959ء ، ص:925

[ii] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص:102

[iii] Frantz Fanon, The Wretched of the Earth, New York: Grove Press, 1963 [First published 1961], p. 100.

[iv] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص:168

[v] قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہمسفر، چودھری اکیڈمی، لاہور، 1979ء، ص:53

[vi] Frantz Fanon, The Wretched of the Earth, New York: Grove Press, 1963 [First published 1961], p. 152.

[vii] بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1981ء، ص:49

[viii] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص:166

[ix] بانو قدسیہ، راجہ گدھ، ص:33

[x] قرۃ العین حیدر، سفینہ غم دل، مکتبہ جدید، لاہور، 1969ء، ص:24

[xi] رضیہ فصیح احمد، انتظار موسم گل، پروین بک ڈپو، رام پور، 1968ء، ص:12